POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 03-04 April 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

ہفت روزہ
ہماری زبان
HAMARI ZABAN
(Weekly)
اشاعت کا 87 واں سال

Date of Publication: 02-04-2026 • Price: 5/- • 8-14 April 2026 • Issue: 14 • Vol:85
۸تا۱۴؍اپریل ۲۰۲۶ء • شمارہ:۱۴ • جلد:۸۵

اُردو کا ایک نابغہ تخلیقی فنکار: ابنِ صفی

پروفیسر مشتاق احمد

عالمی ادب کے سنجیدہ مطالعے سے یہ عقدہ واضح ہو جاتا ہے کہ زبان وادب کی دنیا میں بہت ہی کم ایسی شخصیات پیدا ہوئی ہیں جنھیں نابغہ شخصیت میں شمار کیا جا سکتا ہے بلکہ جارج سینٹبری (George Saintsbury) اپنی مشہورِ زمانہ کتاب 'ادبی تنقید کی تاریخ' میں افسوس ظاہر کرتا ہے کہ اس کے عہد میں کوئی نابغہ وہمہ گیر شخصیت پیدا نہیں ہوسکی۔ یونانی ادب کے عہدِ زرّیں کا فنکار ژینافونیز (Xenophanes) کو بھی یہ شکایت تھی کہ اس کے دور میں بھی دور دور تک کوئی نابغہ شخصیت نظر نہیں آتی۔ واضح ہو کہ ژینافونیز ہومر اور ہراقلطس کا ہم عصر تھا اور اسی کے عہد میں پروٹیگورس (Protagras) نے انسان کو کائنات کی بہترین تخلیق کہا تھا اور فنونِ لطیفہ کی اہمیت وافادیت کا اعتراف کیا تھا۔ اسی عہد میں سوفسطائیوں (Sophists) نے ادب اور فنونِ لطیفہ کے ساتھ ساتھ مذہب وسماج کے مروجہ عقائد وتصورات پر اعتراض کیے تھے لیکن اس نے ایک اہم نکتے کی بات کہی تھی کہ ادیب وفنکار کو ہم عصر زندگی کے اہم مسائل کو موضوع بنانے کے ساتھ ساتھ اس دنیا کی سیر بھی کرانی چاہیے جو دنیا انسان کو حیرت واستعجاب میں مبتلا کر دے۔ افلاطون نے بھی اپنے مکالمہ 'ایان' (Ion) میں بھی کچھ اسی طرح کا تصور پیش کیا تھا۔ غرض کہ یونانی ادب کی تاریخ میں ایک مدت تک یہ بحث جاری رہی کہ ادب صرف اور صرف تفریحی ذہنی اُپج ہے یا غور وفکر کا لا متناہی سلسلہ۔ جہاں تک ادب میں مافوق الفطرت اور ماورائی دنیا کی موضوعیت کا سوال ہے تو اس کی تاریخ بھی بہت قدیم ہے کہ مشرق ومغرب کے بیشتر نظریہ سازوں نے اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ ادب صرف ذہنی آسودگی یا افسردگی کا سامان نہیں ہے بلکہ قاری کے ذہن ودل میں انسانی زندگی کی جو تلخیاں ہیں اس کے احساسات کے ساتھ ساتھ زندگی کی خوب صورتی کا ادراک اور چشمہ تاریخی شعور میں تلاطم بھی پیدا کرے۔

مذکورہ نظریوں کی روشنی میں جب ہم اسرار احمد ابنِ صفی (ولادت: 26 جولائی 1928، وفات: 26 جولائی 1980) کے سرمایۂ افکار و نظریات کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ اردو میں ابنِ صفی ایک نابغہ شخصیت کا نام ہے۔ وہ ایک ہمہ گیر تخلیقی فنکار ہیں اور انھوں نے نثر ونظم دونوں اصنافِ ادب میں اپنی فکری جہات کا مظاہرہ کیا ہے۔ بالخصوص سرّی ادب کو جو معیار و وقار بخشا اس سے اردو سرّی ادب کو نہ صرف اعتبار حاصل ہوا بلکہ دوسری زبانوں کے ادبا بھی ابنِ صفی کی تخلیقی جہات کی اہمیت وافادیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہاں اس حقیقت کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ابنِ صفی کو جو اردو کا معاشرہ ملا تھا وہ بھی بہت زرخیز تھا۔ اردو گھرانوں میں اردو کے کتب ورسائل کی خریداری اور ان کا مطالعہ روزمرہ کی زندگی کا حصہ بن گیا تھا لہٰذا مختلف شعبۂ حیات کے افراد تک ابنِ صفی کی تحریریں پہنچیں اور چوں کہ اردو میں پہلے سے ہی داستانی ادب کے مطالعے کا ماحول تھا، اس لیے ابنِ صفی کے جاسوسی ناول کی قرأت کا چسکا لگنے میں دیر نہیں لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے ابنِ صفی کی تحریروں کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ عربی اور فارسی داستانوں کے ساتھ ساتھ اردو داستانوں کی دنیا سے آشنا طبقہ جب انگریزی کی طرف مخاطب ہوا تو وہاں بھی سرّی ادب کے غیر معمولی نمونے موجود تھے۔ ڈکنز، ولکی کولنز، ایڈگر ایلن پو کی پر اسرار کہانیوں اور جاسوسی افسانوں کا انبار تھا جس سے اردو معاشرے کا تعلیم یافتہ طبقہ خوب خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایسے وقت میں جب ابنِ صفی کی پر اسرار تحریریں سامنے آئیں تو وہ چشم کشا ثابت ہوئیں اور ہر پڑھے لکھے شخص کی ذہنی آسودگی کا لازمی جزو بن گئیں۔ اگرچہ اردو میں جاسوسی قصوں کہانیوں کے تراجم موجود تھے کہ فیروز بن مراد نے شرلک ہومز کی تحریروں کو اردو میں منتقل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور ہومز کے منتخب جاسوسی افسانوں کا 'حکایت شرلک ہومز' اردو ترجمہ آ چکا تھا۔ فیروز بن مراد کے علاوہ ظفر عمر بھی کئی جاسوسی کہانیوں کا ترجمہ کر چکے تھے۔ تیرتھ رام فیروز پوری کے تراجم سے بھی اردو دنیا واقف ہو چکی تھی لیکن اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو میں خالص جاسوسی ادب کو فروغ دینے کا سہرا ابنِ صفی کے سر ہی بندھتا ہے کہ انھوں نے سراغ رسانی ادب کی بنیاد صرف اور صرف تفریحی مقصد تک محدود نہیں رکھی بلکہ انقلاباتِ زمانہ کی سائنسی جدید ترین ایجادات کو بھی موضوع بنایا اور افسانوی رنگ میں کچھ اس طرح پیش کیا کہ ان کے بیشتر ناولوں کے کردار مثالی بن گئے۔ میرا تو یہ واضح نقطۂ نظر ہے کہ ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں کے کردار ہمارے معاشرے کے جیتے جاگتے اشخاص ضرور ہیں لیکن وہ ذہنی طور پر اتنے بیدار مغز ہیں کہ ان کی ہر ایک حرکت اور عمل ہمارے لیے حیرت واستعجاب میں ڈالنے والا ہوتا ہے۔ ہم جن جوہری آلات کے نام سے بھی ناواقف ہوتے ہیں ابنِ صفی کے کردار ان سائنسی جدید ایجادات کے آلات کا استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ہمیں ایک حیرت انگیز دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔ میرے ذہن پر اس وقت مجنوں گورکھپوری کے مضمون 'اردو میں جاسوسی افسانہ' کا یہ اقتباس دستک دے رہا ہے:

> ''اردو میں جدید جاسوسی افسانے کی ایک مستقل صنف کی حیثیت سے ابنِ صفی نے ابتدا کی اور ان کی تقلید میں نوجوان جاسوسی افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہوگئی۔ بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ ان کے بہت سے افسانوں میں کردار اور مواقع کے اعتبار سے یکسانی پیدا ہوگئی ہے، یہ شکایت بجا ہے، مگر جو شخص معاشرے کے ایک ہی پہلو کو لے کر اتنے افسانے یا ناول لکھے گا اس کے یہاں کسی نہ کسی حد تک یکسانی پیدا ہو جائے گی لیکن چند کو چھوڑ کر ان کے ناول عام طور سے ہم کو تھکاتے نہیں بلکہ وقت گذاری کے لیے اچھا ذریعہ ہوتے ہیں۔''

میری ناقص رائے یہ ہے کہ ابنِ صفی کا ایک سب سے بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ ان کے افسانوں اور ناولوں نے اردو معاشرے میں جنسی ادب کے مطالعے کی جو روش عام ہوگئی تھی، اس سے نجات دلائی اور تاریخی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب رہے۔ ان کے موضوعات تو اچھوتے تھے ہی، ان کی کہانیوں کی تکنیک بھی منفرد تھی اور اسلوب بھی جداگانہ۔ جرائم کی دنیا کی پرت در پرت کھولنے میں انھیں جو مہارت حاصل تھی وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئی، مگر افسوس صد افسوس کہ اردو کے ناقدینِ ادب نے ابنِ صفی کے تخلیقی سرمایے کو تفریحی ادب کے خانے میں رکھ کر نظر انداز کیا اور ان کی ہمہ جہت فکر ونظر کی تہوں تک پہنچنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیائے ادب میں اسرارِ سراغ رسانی اور تجسس کو فن کی صورت میں پیش کرنے والا ایک بڑا فنکار ناانصافیوں کا شکار ہوتا رہا ورنہ فریدی، حمید، قاسم، عمران، جوزف، سلیمان، روشی، جولیانا جیسے ابدی کردار کے خالق گمنامیوں کے بادل میں

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

کیوں چھپا رہتا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے اس نابغۂ روزگار شخصیت کی تحریروں کی عصری اہمیت کا اعتراف کیا جائے اور اردو میں جاسوسی ادب کے قطب نما کی خدمات پر بھرپور لکھا جانا چاہیے۔ابنِ صفی نے اپنے ایک مضمون 'میں نے لکھنا کیسے شروع کیا' میں اس دکھ کا اظہار کیا ہے:

'مجھے اس وقت بڑی ہنسی آتی ہے جب آرٹ اور ثقافت کے علم بردار مجھ سے کہتے ہیں کہ میں ادب کی بھی کچھ خدمت کروں۔ ان کی دانست میں شاید میں جھک مار رہا ہوں۔ حیات وکائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے میں نے اپنی کسی نہ کسی کتاب میں نہ چھیڑا ہو لیکن میرا طریقِ کار ہمیشہ عام روش سے الگ تھلگ رہا ہے ۔ میں بہت زیادہ اونچی باتوں اور ایک ہزار کے ایڈیشن تک محدود رہ جانے کا قائل نہیں ہوں۔ میرے احباب کا اعلا وارفع ادب کتنے ہاتھوں تک پہنچتا ہے اور انفرادی یا اجتماعی زندگی میں کس قسم کا انقلاب لاتا ہے؟''

بلاشبہ ابنِ صفی کی تحریروں میں حیات وکائنات کے تمام تر قوسِ قزح نمایاں ہیں اور اس تلخ حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ ابنِ صفی نے اردو افسانوی دنیا کی عام روش سے ہٹ کر ایک ایسی نئی راہ اختیار کی جس راہ پر لوگ چلنے کو مجبور ہوئے۔ وہ روایتی راہ کے قائل نہیں تھے اور شاید اسی لیے ان کے ڈھائی سو سے زائد ناولوں کی دنیا ایک نئی دنیا میں ہمیں لے جاتی ہے۔ابنِ صفی نے خود بھی اعتراف کیا تھا کہ ان کا پہلا ناول 'دلیر مجرم' ایک انگریزی ناول کا ترجمہ تھا۔تمام ناول ان کی حقیقی تخلیقیت کے آئینہ دار ہیں۔

ابنِ صفی نے اپنی جاسوسی تحریروں سے دوسرا بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ انھوں نے اپنے کرداروں کے ذریعے اردو معاشرے کو قانون کے احترام کا سلیقہ سکھایا۔ان کے کردار صرف جرائم کی دنیا کے ہیرو نہیں ہیں بلکہ اس کردار کی نفسیاتی گتھیوں تک پہنچے تو خود بخود یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ابنِ صفی اپنے جرائم پیشہ کرداروں کے ذریعے کون سے اسباق سکھانا چاہتے ہیں۔انھوں نے اپنے مضمون 'میں نے لکھنا کیسے شروع کیا' میں خود بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

'میں سوچتا رہا۔آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی میں جب تک قانون کے احترام کا سلیقہ نہیں ہوگا یہی سب کچھ ہوتا رہے گا۔ یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سیکھے۔ جاسوسی ناول کی راہ میں نے اس لیے منتخب کی تھی۔تھکے ہارے ذہنوں کے لیے تفریح بھی مہیا کرتا رہوں اور انھیں قانون کا احترام بھی سکھاتا رہوں۔فریدی میرا آئیڈیل ہے جو خود بھی قانون کا احترام کرتا ہے اور دوسروں سے قانون کا احترام کرانے کے لیے اپنی زندگی تک داؤ پر لگا دیتا ہے۔''

یہاں مجھے نتھانیل ہاتھورن (Nathanial Hawthorns, 1804-1864) کی وہ بات یاد آرہی ہے جو اس نے اپنی کتاب Seven tells of my native land یعنی 'میرے وطن کی سات کہانیاں' میں لکھا ہے کہ ایک ادیب کو لکھتے وقت ہمیشہ یہ بات ذہن نشیں رکھنی چاہیے کہ اس کے لکھنے کا ایک خاص 'مشن' بھی ہے۔ظاہر ہے کہ ہر ایک چھوٹے بڑے فنکار کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کی تحریر قاری کے ذہن پر اپنا دائمی نقش چھوڑے، مگر سچائی یہ ہے کہ اس کوشش میں بہت کم فنکار ہی کامیاب ہو پاتے ہیں۔ابنِ صفی ان خوش نصیب فنکاروں میں ہیں جو اپنے مشن میں کامیاب رہے اور اپنے لازوال کرداروں کے ذریعے اپنے مشن کو فروغ دیتے رہے۔ان کے ناول 'گارڈ کا اغوا' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''مجھے جاسوسی کہانیاں بہت پسند ہیں!

تمھاری لائن کی چیز ہے! میرا خیال ہے کہ جاسوسی کہانیاں تباہ کن ہوتی ہیں!

کیوں؟

ان سے جرائم پھیلتے ہیں!

میں اسے تسلیم نہیں کر سکتا'

راجن نے سر ہلا کر کہا

ہمارے یہاں کے زیادہ تر جرائم پیشہ لکھ پڑھ نہیں سکتے'

پنچانوے فیصد جاہل ہوتے ہیں!

جرائم کی جڑیں دراصل مایوسی میں ملتی ہیں!

میں نہیں سمجھی

جس معاشرے کے لوگ مستقبل کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں وہیں جرائم کی گرم بازاری بھی ہو جاتی ہے۔''

اس مکالمے کی قرأت ذرا سنجیدگی سے کیجیے اور پھر ابنِ صفی کے نظریے کی زیریں لہروں تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔نصف صدی پہلے لکھا گیا ناول اور اس کے کرداروں کے مکالمے حالاتِ حاضرہ کی عکاسی نہیں کرتے؟ یہ مکالمہ صرف اور صرف ابنِ صفی ہی لکھ سکتے تھے۔ابنِ صفی کے کردار اپنی زندگی کے تجربات ومشاہدات کے غماز ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے ناولوں میں فسوں اور حقیقت کے درمیان کا فاصلہ ختم ہو جاتا ہے۔یہ وصفِ کمال ایسے فنکار کا حصہ ہوتا ہے جو بے پناہ تخلیقی قوت رکھتے ہوں۔ ابنِ صفی کے ناولوں میں الفاظ کا سیلاب کچھ اس طرح رواں دواں رہتا ہے جس طرح کسی بلند پہاڑی سے چشمہ پھوٹ کر اس کا پانی آبشار کی صورت میں زمین پر ایک نغمہ سا برپا کر رہا ہو۔امریکی ناول نگار جان اسٹین بیک (John Steinbeek) جسے 1962 میں نوبل انعام ملا تھا اس نے ایک بہت اچھی بات کہی تھی کہ جس فنکار کی تحریر میں حقیقت پسندی اور رومانیت کا رنگ وروغن ایک ساتھ مل جائے اس کی تحریروں میں معنویت کے کئی روزن کھل جاتے ہیں۔ ابنِ صفی کے بیشتر ناولوں میں حقیقت پسندی اور رومانیت کی زیریں لہریں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ہم سب اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ابنِ صفی کا مطالعہ بہت وسیع اور عمیق تھا۔وہ مختلف موضوعات کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے اور ان کو اپنے ناولوں میں پیش بھی کرتے تھے، اس لیے ان کے یہاں سیاسیات، مذہبیات، اخلاقیات، تہذیب وتمدن اور ثقافت کے موضوعات عیاں نظر آتے ہیں۔ بالخصوص سیاسیات کو موضوع بنانے میں انھیں مہارت حاصل تھی اور حالاتِ حاضرہ کی عکاسی کا فن تو کوئی ابنِ صفی سے سیکھے۔ جمہوری طرزِ حکومت کو دنیا میں سب سے بہتر عوامی حکومت سمجھا جاتا ہے، ابنِ صفی کی زبانی جمہوریت کی حقیقت سنیے:

''ان کا طرزِ حکومت جمہوری کہلاتا ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مغز چند آدمیوں کے حصے میں آئے اور ہڈیاں عوام کے سامنے ڈال دی جائیں۔ یہ اپنے مسائل طاقت سے ہی حل کرتے ہیں مگر اسے اشتراکِ باہمی کا نام دیتے ہیں۔اس کے حاکم خود کو عوام کا نمائندہ کہتے ہیں، عوام ہی انھیں حکومت کے لیے منتخب کرتے ہیں لیکن یہ ان کی مالی قوت ہی ہوتی ہے جو انھیں اقتدار کی کرسی پر پہنچاتی ہے لیکن وہ اسے عوام کی قوت اور رائے عامہ کہتے ہیں حالاں کہ رائے عامہ مالی قوت سے ہی خریدی جاتی ہے۔'' (تیسرا شعلہ، جاسوسی دنیا)

اس اقتباس کی روشنی میں اپنے وطنِ عزیز کی حالیہ ایک دہائی کی سیاست پر نگاہ ڈالیے اور ابنِ صفی کی دانشوری، سیاسی بصیرت وبصارت کی داد دیجیے کہ جو بات انھوں نے پانچ دہائی پہلے کہی تھی آج وہ حقیقت ہمارے سامنے ہے کہ کس طرح جمہوریت کے نام پر انانیت پروان چڑھ رہی ہے کہ مالی طاقت کی بدولت عوامی نمائندے خریدے جا رہے ہیں، عوام ووٹ کسی سیاسی جماعت کو کر رہے ہیں اور حکومت کوئی اور سیاسی جماعت تشکیل دے رہی ہے پھر بھی ہم فخریہ نعرہ لگا رہے ہیں کہ ہم دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے علمبردار ہیں۔

عمران سیریز کے بیشتر کرداروں کی زبانی ابنِ صفی اپنے نظریۂ زیست کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔ چند اقتباسات دیکھیے:

'نیچر آدمی کو بری طرح الّو بناتی ہے۔ وہ ورڈز ورتھ ہو جاتا ہے، کٹس ہو جاتا ہے، بائرن ہو جاتا ہے... میر ہو جاتا ہے، غالب ہو جاتا ہے، دفتر کے دفتر سیاہ کرتا ہے!.....مگر مقصد.....مقصد ان سب کا صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بچے کا باپ بننا چاہتے ہیں'۔

(لڑکیوں کا جزیرہ، عمران سیریز)

''ہماری زمین کے سینے میں کیا نہیں ہے مگر ہم مفلس ہیں۔ ہمیں باتیں بنانی آتی ہیں، ہم تقریر کر سکتے ہیں، ایک دوسرے پر اپنی ذہنی برتری کا رعب ڈال سکتے ہیں، ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے کے لیے اپنی بہترین ذہنی صلاحیتیں ضائع کر سکتے ہیں لیکن ہم سے تعمیری کام نہیں ہو سکتے۔''

(شیطان کی محبوبہ، جاسوسی دنیا)

میرے خیال میں ابنِ صفی کا یہی تخلیقی وصف انھیں صرف تفریحی ادب تک محدود نہیں رکھتا بلکہ ادب، سیاسیات، اخلاقیات اور سائنسی علوم وفنون سے دل چسپی رکھنے والے سنجیدہ حلقے میں بھی قبولیت کا درجہ بخشتا ہے۔ اس عہد کے میڈیکل ڈاکٹر ہوں کہ انجینئر، سائنس داں ہوں کہ سیاست داں، مذہبی پیشوا ہوں کہ تاجر پیشہ افراد، ہر ایک نے ابنِ صفی کی تحریروں کو حرزِ جاں بنائے رکھا اور ان کی خلاقانہ ذہنیت کے قصیدہ خواں رہے۔

ابنِ صفی نے ایک طرف اگر جرائم کی نفسیات کی گتھیوں کو سلجھانے کا کام کیا تو دوسری طرف اپنی تحریروں میں طنزیہ ومزاحیہ عنصر کی پیشکش کو بھی اپنا وتیرہ بنائے رکھا۔ان کے ناولوں میں سماجی، مذہبی، اخلاقی، اقتصادی اور بالخصوص مصنوعی زندگی جینے والے معاشرے پر ایک تیکھا طنز بھی دیکھنے کو ملتا ہے لیکن اس طنز سے کوئی دل برداشتہ نہیں ہوتا بلکہ قہقہوں کی گونج میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کے لیے ابنِ صفی محاوروں کا خوب خوب استعمال کرتے ہیں بالخصوص فریدی اور حمید کے مکالمے میں محاورے کا استعمال ان کی تحریر میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ یہ مکالمہ دیکھیے:

''بہت اونچے اڑ رہے ہیں آج'

حمید مسکرا کر بولا

کب نہیں اڑتا

اچھا باتیں بند!

تمھارا اوپری ہونٹ یوں ہی ہر وقت دست بہ دعا رہتا ہے اور جب بولنے لگتے ہو تو ناک سے جا ملتا ہے ذرا بھینچوا سے ٹھیک کرو...لیکن یاد رہے کہ میکپ کے باوجود بھی تمھاری آنکھوں پر تاریک عینک ہونی چاہیے۔جیسیکا کی نظریں بہت تیز ہیں جو اسکاٹ لینڈ یارڈ کا مخصوص کیمرہ غائب کر سکتی ہے، نری ڈیوٹ ہی نہ ہوگی؟ بہر حال اس کے دن پورے ہو گئے'

اوہو! فریدی مسکرا کر بولا

تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا

کیا مطلب؟

اگر اس کے دن پورے ہو گئے ہیں تو تم پر کسی دائی یا نرس کا میکپ زیادہ مناسب رہتا؟

حمید جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگا''

یہ ذکر پہلے ہی ہو چکا ہے کہ ابنِ صفی مختلف النوع مضامین پر گہری نظر رکھتے تھے کہ ان کا مطالعہ عمیق تھا بالخصوص انسانی نفسیات کی تہ در تہ تک پہنچنے کی صلاحیت ان کے اندر موجود تھی۔یہی وجہ ہے کہ وہ انسانی نفسیات کے نبض شناس تھے اور ان کی تحریروں میں ...(بقیہ صفحہ 7 پر)

مادری زبان کی چاشنی ذہن نشینی سے دل نشینی تک

انجینئر محمود اقبال

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
(مولانا الطاف حسین حالؔی)

''اگر آپ کسی شخص سے ایک ایسی زبان میں بات کریں جس کو وہ سمجھتا ہو تو آپ کی بات اس کے ذہن نشین ہوجائے گی، اگر آپ اس سے اس کی زبان میں بات کریں تو یہ بات اس کے دِل نشیں ہوگی''۔ جنوبی افریقہ کے 'گاندھی' نیلسن منڈیلا کا یہ قول ہے، اور بالکل بالفعل ہے۔ ہر سال دنیا بھر میں 21 فروری کو اقوامِ متحدہ کی ذیلی تنظیم یونسکو کی طرف سے 'عالمی یومِ مادری زبان' منایا جاتا ہے۔ مگر کیوں؟ اس کی وجہ جان کر شاید آپ حیران ہوجائیں گے۔ وجہ ہے اپنی ہی بے چاری مادری زبان 'اردو'۔ آپ کو پتا ہے نہ کہ پاکستان کے دو ٹکڑے کیوں ہوئے تھے؟ مادری زبان ہی کی وجہ سے۔ بنگالیوں نے وہ شور شرابہ اور ادھم مچایا کہ ہم کسی صورت اردو کو اپنی مادری زبان ''بنگالی'' پر ترجیح نہیں دیں گے۔ بنگالی ہی ہماری مادری زبان ہے اور سرکاری بھی ہوگی۔ ہمیں کسی صورت اردو قبول نہیں اور ہم پر زبردستی مسلط نہ کی جائے۔ اور... بنگلہ دیش آزاد دیش بن گیا۔ اور پاکستانی، بنگالیوں کا منہ تکتے ہی رہ گئے تھے، جو لنگی باندھے اور ہاتھ میں ڈنڈے لیے اردو اور پاکستانیوں کی مخالفت میں سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ یہ دن 1952 کی 21 فروری کی وجہ سے چنا گیا ہے، جس دن ڈھاکہ یونیورسٹی، جگن ناتھ یونیورسٹی اور ڈھاکہ میڈیکل کالج کے طلبہ پاکستان میں اردو کے ساتھ بنگالی کو بھی قومی زبان بنانے کے لیے احتجاج کررہے تھے۔ اور... پولیس نے گولی چلا کر انھیں ڈھاکہ میں شہید کردیا تھا۔ شہدا کی یاد میں بنگالیوں نے ڈھاکہ میں ایک مینار تعمیر کیا تھا۔ یونیسکو نے یہ فیصلہ 17 نومبر 1999 میں لیا تھا کہ ہر سال 21 فروری کو 'عالمی یومِ مادری زبان' کے طور پر منایا جائیگا۔ بعدازاں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 2008 میں اس فیصلہ پر مہر لگائی تھی۔ یونیسکو کے اس اعلان کا مقصد عالمی سطح پر لسانی اور ثقافتی تنوع کو فروغ دینا ہے۔ یونیسکو کی طرف سے اس سال 2026 کا تھیم یعنی، موضوع یہی ہے!

کثیر لسانی تعلیم پر نوجوانوں کی آواز

کیا اُردو مسلمانوں کی زبان ہے؟ بالکل نہیں! کیا عربی مسلمانوں کی زبان ہے؟ جی نہیں! اردو ہماری مشترکہ ثقافتی تہذیب وتمدن کی دین ہے جس کا آغاز 12 ویں صدی کے بعد ہندستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہوا۔ عربی قرآن شریف کی زبان ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کو چاہیے کہ عربی زبان پر عبور حاصل کریں اور قرآن کو قرآن کی زبان میں پڑھنے اور سمجھنے کی سعادت حاصل کریں۔ نسلِ نو کے طلبہ و طالبات کو چاہیے کہ وہ کمپیوٹر زبانوں کو سیکھیں اور دین و دنیا میں اپنا مقام بنائیں۔ پہلی زبان عربی، دوسری مادری زبان چاہے وہ جو بھی ہو اور تیسری انگریزی ان تین سے زیادہ سیکھنا وقت اور پیسہ کا ضیاع ہے۔ اسی میں، میں نسلِ نو کی بھلائی اور روشن مستقبل کو دیکھتا ہوں۔ میری پہلی تجویز و کالت ہے کہ ہندستان میں مسلم نسلِ نو کے لیے عربی اور اردو لازم وملزوم ہوں۔ زبان کا کوئی علاقہ، کوئی نسل یا رنگ نہیں ہوتا۔ یہ اسی کی ہوتی ہے جو اسے بولتا ہے۔ چند سال پہلے حیدرآباد یونیورسٹی کے ایک سمینار میں شرکت کا مجھے اتفاق ہوا تھا۔ ڈائس پر اردو کے ممتاز طنز و مزاح نگار مرحوم جناب مجتبیٰ حسین کی بغل میں گدوال کی آنجہانی راج کماری اندرادھن راج گیر بھی تشریف فرما تھیں۔ اپنی تقریر میں راج کماری جی نے ببانگِ دُہل کہا تھا کہ میرے گھر میں اردو بولی جاتی ہے۔ یہ سن کر مجھے تعجب نہیں ہوا تھا چوں کہ اردو مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کی کثیر تعداد کی مادری زبان اردو ہے۔ جس کی وجہ شاید اردو رسمِ خط ہے جو عربی اور قرآن کی زبان سے ملتا ہے، ورنہ تمل مسلمانوں کی اکثریت تمل بولتی ہے اسی طرح بنگال میں، زیادہ تر مسلمانوں کی مادری زبان بنگلہ ہے۔ اسی طرح دیگر ریاستوں میں بھی ہے۔

ہندستان ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں ہزاروں سال سے مختلف مذاہب، رنگ ونسل وزبانوں کے لوگ رنگ وخوشیاں بکھیر رہے ہیں۔ اردو اتنی لچکدار اور خوب صورت زبان ہے کہ اس میں مختلف زبانوں کے الفاظ ایسے سما جاتے ہیں کہ اصل بن جاتے ہیں۔ انگریزی کا 'ایڈمیرل' بڑی خوب صورتی سے اردو میں 'امیر السحر' بن گیا۔ یہ ایسا سانچہ ہے کہ اس میں آمد اور جامد کے راستے کھلے ہیں۔ انگریز فاریسٹ بھول کر اب جنگل بولنے لگے ہیں۔ دستورِ ہند کے تحت 22 زبانیں مسلمہ ہیں جن میں اردو بھی شامل ہے۔ ہندستانی ریاستوں جموں وکشمیر، دہلی، اتر پردیش، بہار اور تلنگانہ میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ لکھنؤ کا اردو داں طبقہ ٹھیٹ ادبی زبان بولتا ہے برخلاف اس کے حیدرآباد دکن میں لہجہ و زبان مختلف ہے۔ یہ کسی بھی زبان کی خوب صورتی ہے۔ مثال کے طور پر سڑک پر کار کا کوئی حادثہ ہوجائے اور وہ پرزہ پرزہ ہوجائے تو لکھنؤ والا ادبی زبان میں اماں... سے شروع کرکے واردات کو بیان کرنے میں ایک پورا پیراگراف لے گا۔ برعکس اس کے ایک حیدرآبادی مختصر جملہ میں سانحہ کو بیان کردے گا کہ 'بیگن میں مل گئی میاں'۔ یہ زبان کی چاشنی و محاورے ہیں جو اردو کو مقبولِ عام زبان بناتے ہیں:

بات کرنے کا حسیں طور طریقہ سیکھا
ہم نے اردو کے بہانے سے سلیقہ سیکھا
(منیش شکلا)

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے منجھے ہوئے غیر اردو داں سیاست داں اپنی بات میں وزن اور زور لگانے کے لیے اردو محاوروں وشعروں کا سہارا لیتے ہیں۔ آنجہانی وزیر خارجہ سشما سوراج جی نے پارلیمنٹ کی ایک تقریر میں اردو کا یہ تاریخی شعر پڑھا تھا جو مظفر رزمی کا ہے:

یہ جبر بھی دیکھا ہے تاریخ کی نظروں نے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

اردو شاید دنیا کی پہلی زبان ہے جس کی ابتدا نثر سے ہوئی نہ کہ نظم یا غزل سے۔ مغلوں کی سرکاری زبان فارسی تھی اور وہ اس کی سرپرستی کرتے تھے۔ برخلاف دہلی کے اردو ادب کو حیدرآباد دکن کے گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں میں رسائی و پذیرائی حاصل ہوئی۔ اردو کو ہند-آریائی زبان بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض محققین کو اس پر اختلاف بھی ہے۔ بعض ریسرچ اسکالرس دور کی کوڑی ڈھونڈ لائے ہیں۔ اردو یا ہندستانی کا ارتقا ہزاروں سال پہلے حضرت نوحؑ کے پوتے سے رشتہ جوڑا ہے۔ تحقیق کا نچوڑ یہ ہے کہ نوحؑ کے پوتے یعنی حضرت ہند بن عام بن نوح برصغیر میں مقید ہوگئے تھے اور ہندستان کے مرکب سے ہندستان کا لفظ معرض وجود میں آیا تھا اور یہ زبان ان سے پہلے بھی ہندستان کی سرزمین پر بولی جاری تھی۔ 12 ویں صدی کے بعد سے یہ زبان ہندوی، زبان ہند، ہندی، زبان دہلی گجری، دکنی زبان، اردوے معلیٰ، زبان اردو، اور آخر میں جا کر دور حاضر میں اس زبان کی تان صرف 'اردو' پر ٹوٹی ہے جسے آپ اور ہم سمجھتے اور بولتے ہیں۔ غالبؔ نے اس زبان کو ریختہ کا بھی نام دیا تھا۔

بالی ووڈ کی زیادہ تر کامیاب فلمیں اردو ادب، شاعری، محاوروں اور ڈائیلاگ کی مرہون منت ہیں۔ اردو دشمنی میں بعض نادان ہندی میڈیا والے اردو زبان سنسکرت میں بولنے کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ نہیں بن پاتا تو مجبوراً اردو محاوروں کا سہارا لیتے ہیں۔ کچھ دنوں پہلے کی بات ہے ایک پرائم ٹائم شو میں ایک کٹر ہندی داں سیاسی پارٹی کا ترجمان کہہ رہا تھا 'ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا'۔ دوسری پارٹی کے ترجمان کو کچھ نہ سوجھا تو کہہ دیا: 'منہ میں رام، چھری بغل میں'۔ مسکرائیں نہ پلیز... اچھے خاصے اردو محاورے 'بغل میں چھری منہ میں رام رام' کی بے چارے نے ارتھی اٹھادی تھی۔ نفرتوں کی بڑھتی ہوئی دیواروں کو ایک نہ ایک دن اردو ہی لگام دے گی۔ بعض ابنائے وطن کے نزدیک رام، بھگوان ہیں اور ہمارے نزدیک رام جی بقولِ علامہ اقبالؔ 'امام الہند' ہیں:

ہے رام کے وجود پہ ہندستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

اردو کا ذکرِ خیر ہو اور غزل کو ہم بھول جائیں؟ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ ہمارے پیارے پیارے شاعروں نے ایسی پیاری پیاری غزلیں کہی ہیں کہ اردو کا نام سارے جہاں میں روشن کردیا ہے۔ اچھا ہوا نوبل پرائز کمیٹی والوں کو اردو نہیں آتی ورنہ غالب کے ایک ایک نادر شعر پر انہیں ادب کا نوبل انعام بعد از مرگ دینا پڑتا۔ 'غزل' عربی زبان کا لفظ ہے۔ غزل کا لفظ غزال سے نکلا ہے اور غزال ہرن کے گلے سے نکلنے والی اس آواز کو کہتے ہیں جب وہ شیر کے خوف سے بھاگ رہی ہوتی ہے۔ غزل کے لغوی معنی 'عورت سے باتیں' کرنا بھی ہے، یعنی غزل عشق ومحبت کی قلبی واردات کی ترجمان ہوتی ہے۔ لغوی اعتبار سے اردو دراصل ترک زبان کا لفظ ہے جسے انگریزی میں او، آر، ڈی، یو Ordu لکھا جاتا ہے جس کے معنی چھاؤنی یا شاہی پڑاؤ ہے۔ ترک فوج کی چھاؤنیوں میں اردو زبان کا ارتقا ہوا اور ترکش، فارسی، عربی اور ہندی زبانوں کے حسین امتزاج سے اردو عالم وجود میں آئی اور اسی لیے ہندستان کی تاریخ میں اسے لشکری زبان کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اردو کو فارسی وعربی کا رسمِ خط نصیب ہوا اور ہندی کو دیوناگری کا۔ اردو اور ہندی ہماری مشترکہ تہذیب، ثقافت وکلچر کا نچوڑ ہیں۔ مشترکہ طور پر ان دونوں زبانوں کو 'ہندستانی' کہا جاتا ہے اور یہ جنگِ آزادی کی زبان بن گئی تھی۔ 'ہندستانی' کو بابائے قوم مہاتما گاندھی نے پسند کیا تھا۔ 'جے ہند' کا نعرہ بھی نیتاجی سبھاش چندر بوس کی دین ہے۔ آزادی کے بعد پارلیمنٹ میں سرکاری زبان کا بل پیش ہوا تھا اور ایک ووٹ کی کمی سے اردو سرکاری زبان بنتے بنتے رہ گئی، لیکن پاکستان میں اسے سرکاری زبان کا درجہ مل گیا تھا۔

اس فورم اور موضوع پر میری دوسری تجویز و وکالت ہے کہ پارلیمنٹ میں سرکاری بل کے ذریعے 'ہندستانی' کو سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا جائے اور رسمِ خط دونوں زبانوں کا ہو۔ ...(بقیہ صفحہ 6 پر)

اردو دُنیا

اتر پردیش اردو اکادمی کی کمیٹی کی تشکیل کا مطالبہ

دیوبند (29 مارچ)۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن (یو ڈی او) کی ایک اہم میٹنگ میں قومی کونسل برائے فروغِ اردو (این سی پی یو ایل) کے ازسرِ نو تشکیل کے حوالے سے مرکزی حکومت کی جانب سے ملنے والے مثبت جواب پر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ عہدیداران نے کہا کہ اس پیش رفت سے کونسل کی انتظامی سرگرمیوں کے دوبارہ آغاز کی امید روشن ہوگئی ہے۔ یو ڈی او کے ضلع صدر کلیم تیاگی نے کہا کہ این سی پی یو ایل کے سلسلے میں غیر یقینی صورتِ حال بنی ہوئی تھی، تاہم اب مرکزی حکومت کے جواب سے حالات واضح ہوگئے ہیں۔ انھوں نے اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کی کمیٹی کی تشکیل کا مطالبہ بھی کیا۔ تنظیم کے سرپرست ڈاکٹر شمیم الحسن نے کہا کہ اتر پردیش اردو اکادمی کی کمیٹی بھی تشکیل نہیں کی گئی ہے جس کی وجہ سے صوبے کی دوسری سرکاری زبان کے کام کاج ٹھپ پڑے ہوئے ہیں اور اردو زبان کے فروغ میں رکاوٹ کے ساتھ ساتھ اردو زبان سے وابستہ شاعر و ادیب بھی مایوسی کا شکار ہیں۔ تنظیم کے وزیرِ اعلا یوگی آدتیہ ناتھ سے مطالبہ کیا گیا کہ جلد از جلد اردو اکادمی کی کمیٹی تشکیل کی جائے۔ ساتھ ہی ایک میمورنڈم بھیجنے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ کنوینر تحسین علی اساروی نے کہا کہ تنظیم نے اردو کے حقوق کے لیے ہائی کورٹ سے لے کر سپریم کورٹ تک جدوجہد کی ہے۔ انھوں نے زور دیا کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے معاشرے کو بھی آگے آنا ہوگا اور نئی نسل کو اس سے جوڑنا ضروری ہے۔ میٹنگ میں ڈاکٹر شمیم الحسن، حاجی سلامت راہی، کلیم تیاگی، تحسین علی، شمیم قصار، بدرالزماں خاں، ڈاکٹر فرخ حسین، ندیم ملک، گلفام احمد، ماسٹر خلیل احمد، ماسٹر امتیاز علی سمیت دیگر افراد موجود تھے۔ (روزنامہ 'اردو ٹائمز' ممبئی)

جوہر فاؤنڈیشن امین آباد میں
'اردو کل، آج اور کل' کے عنوان پر سمینار کا انعقاد

لکھنؤ (28 مارچ)۔ سماجی تنظیم ہوپ ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن اور اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے اشتراک سے 'اردو کل، آج اور کل' کے عنوان سے شاندار سمینار کا انعقاد جوہر فاؤنڈیشن ہال لکھنؤ میں کیا گیا۔ ڈاکٹر اکبر بلگرامی نے کہا کہ اردو کی خدمات تاریخ کا ایک روشن باب ہے اور ملک کی آزادی میں اردو زبان کا کردار ناقابلِ فراموش ہے، اس لیے ہمیں مایوس ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے محبانِ اردو سے اپیل کی کہ اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم سے آراستہ کریں۔

اس موقعے پر تنظیم کے سکریٹری اعزاز حسین نے مہمانوں کا استقبال شال، مومینٹو اور بیج لگا کر کیا۔ سمینار کی صدارت ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی (اسسٹنٹ پروفیسر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس)، مہمانِ خصوصی معروف شاعر شہریار جلال پوری اور مہمانِ ذی وقار کی حیثیت سے تبسم خاں (اسسٹنٹ پروفیسر اسلامیہ ڈگری کالج، لکھنؤ) نے کی۔ سمینار میں ڈاکٹر نزہت فاطمہ (کرامت ڈگری کالج لکھنؤ)، ڈاکٹر افغان احمد، ڈاکٹر راج کمل گپتا اور سینئر صحافی محمد غفران نسیم نے اپنے مقالات پیش کیے۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

اُردو ترجمہ نگاری کی اہمیت پر سرٹیفکیٹ کورس کا آغاز

بیدر (29 مارچ)۔ انجمن ڈگری کالج بیجاپور شعبۂ اردو کے زیرِ اہتمام بعنوان 'اردو ترجمہ نگاری کی اہمیت پر سرٹیفکیٹ کورس' کا آغاز ہوا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ایس. جے. جاگیردار، ڈاکٹر سیّد علیم اللہ حسینی اور پروفیسر ایم. اے. پیران نے خطاب کیا۔ ڈاکٹر ایس. جے. جاگیردار (پرنسپل انجمن ڈگری کالج) نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ موجودہ دور میں علم کے تبادلے کے لیے ترجمہ ناگزیر ہو چکا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کے سرٹیفکیٹ کورسز طلبہ کی صلاحیتوں کو نکھارنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور انھیں روزگار کے بہتر مواقع فراہم کرتے ہیں۔ ترجمہ صرف الفاظ کی تبدیلی نہیں بلکہ تہذیبوں اور افکار کی منتقلی کا نام ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ عصرِ حاضر میں ترجمہ نگاری کے ذریعے نئی معلومات تک رسائی آسان ہوگئی ہے اور طلبہ کے لیے یہ میدان وسیع امکانات رکھتا ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ یہ کورس طلبہ میں ترجمہ نگاری کا ذوق پیدا کرے گا اور مستقبل میں معیاری مترجمین تیار کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ اس کے بعد پروفیسر ایم. اے. پیران (صدر شعبۂ ہندی) نے ترجمہ نگاری کو تعلیمی ضرورت قرار دیتے ہوئے کہا کہ عالمی سطح پر علم و تحقیق کے تبادلے میں مترجمین کا کردار نہایت اہم ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان میں سائنسی، سماجی اور ادبی مواد کے ترجمے کی اشد ضرورت ہے تاکہ اردو داں طبقہ جدید علوم سے مستفید ہو سکے۔ انھوں نے اس سرٹیفکیٹ کورس کو طلبہ کے لیے ایک سنہری موقع قرار دیا اور کہا کہ اس طرح کے تربیتی پروگرام طلبہ کی علمی و عملی صلاحیتوں کو نکھارتے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر سیّد علیم اللہ حسینی (صدر شعبۂ اردو انجمن ڈگری کالج) نے کہا کہ ترجمہ نگاری عصرِ حاضر کی علمی ضرورت بن چکی ہے۔ انھوں نے کہا کہ دنیا بھر میں پیدا ہونے والے نئے افکار، تحقیقات اور سائنسی معلومات کو اپنی زبان میں منتقل کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ترجمہ نگاری دراصل زبانوں کے درمیان رابطے کو مضبوط بنانے کا موثر ذریعہ ہے جس کے ذریعے مختلف تہذیبیں ایک دوسرے کے قریب آتی ہیں۔ انھوں نے طلبہ کو مشورہ دیا کہ وہ ترجمہ نگاری کو محض ایک تعلیمی سرگرمی نہ سمجھیں بلکہ اسے علم کے فروغ کا مشن بنائیں۔ ان کے مطابق اس طرح کے سرٹیفکیٹ کورس طلبہ کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور انھیں عملی میدان کے لیے تیار کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس اجلاس کی نظامت ماہین اتھنی (بی ایس سی فورتھ سمسٹر) نے فرمائی۔ طیبہ منیر (بی ایس سی فورتھ) نے کلامِ پاک سے اس محفل کا آغاز فرمایا اور امیر اپٹیل کے شکریے پر اجلاس کا اختتام عمل میں آیا۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

ڈاکٹر رفیق زکریا کالج فار ویمن میں
مضمون نویسی مقابلہ و تقریبِ تقسیمِ انعامات

اورنگ آباد (26 مارچ)۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکیڈمی، ممبئی کے تعاون سے ڈاکٹر رفیق زکریا کالج فار ویمن، اورنگ آباد کے شعبۂ اردو کے زیرِ اہتمام علم و ادب کے فروغ کے مقصد سے ایک بامعنی مضمون نویسی مقابلہ منعقد کیا گیا جس کے بعد 25 مارچ 2026 کو ایک باوقار تقریب میں کامیاب طالبات میں انعامات تقسیم کیے گئے۔ یہ پروگرام طلبہ میں تخلیقی شعور بیدار کرنے اور اردو زبان سے ان کی وابستگی کو مستحکم بنانے کی ایک کامیاب کوشش ثابت ہوا۔ مقابلے کو جونیئر، سینئر اور پی. جی. سطحوں میں تقسیم کیا گیا تھا، جہاں طالبات نے مصنوعی ذہانت، خواتین کے حقوق، آن لائن تعلیم، پسندیدہ ادیب اور سماجی مسائل جیسے اہم موضوعات پر نہایت سنجیدگی اور فکری بصیرت کے ساتھ اپنے مضامین پیش کیے۔ ان تحریروں نے طلبہ کے اندر موجود تخلیقی صلاحیتوں اور ادبی ذوق کو نمایاں کیا۔ تقریبِ تقسیمِ انعامات کا آغاز تلاوتِ کلام پاک اور نعتِ رسولِ مقبولؐ سے ہوا۔ اس موقعے پر مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکیڈمی کے چیئرمین سیّد حسین اختر، پرنسپل ڈاکٹر مخدوم فاروقی، پروفیسر انتخاب حمید، ڈاکٹر شہاب افسر خاں، پروفیسر دوست محمد خاں، نورالحسنین اور خالد سیف الدین سمیت دیگر معزز شخصیات موجود تھیں۔ اپنے خطاب میں سیّد حسین اختر نے اردو زبان کی تہذیبی اور سماجی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان صرف اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ مشترکہ تہذیب، انسانی قدروں اور باہمی احترام کی علامت ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ نوجوان قلموں میں بے پناہ صلاحیت موجود ہے، ضرورت صرف رہنمائی اور مواقع فراہم کرنے کی ہے اور اکیڈمی اس ضمن میں ہر ممکن تعاون جاری رکھے گی۔ دیگر مقررین نے بھی مطالعے کی اہمیت، ادب کے سماجی کردار اور طلبہ کی فکری تربیت پر زور دیا۔ پرنسپل ڈاکٹر مخدوم فاروقی نے اپنے صدارتی خطاب میں تعلیم کو محض ڈگری کے حصول تک محدود نہ رکھنے بلکہ شخصیت سازی اور شعوری بیداری کا ذریعہ بنانے پر زور دیا۔ یہ تقریب نہ صرف ایک تعلیمی سرگرمی تھی بلکہ علم و ادب کے فروغ، فکری بالیدگی اور مثبت معاشرتی شعور کے قیام کی ایک خوبصورت مثال بن کر ابھری۔ پروگرام کے اختتام پر منتظمین اور اساتذہ کی کاوشوں کو سراہا گیا، جن کی محنت اور رہنمائی سے یہ کامیاب تقریب ممکن ہو سکی۔
(سیاسی تقدیر۔ دہلی)

'مشاعرے گنگا جمنی تہذیب کا حسین سنگم'

بارہ بنکی (29 مارچ)۔ مشاعرہ و کوی سمیلن کا انعقاد دراصل ہماری گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دیتا ہے۔ مشاعرے قومی یک جہتی کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں اور اس طرح کے پروگرام کا انعقاد متواتر ہونا چاہیے جس میں دونوں طبقے کے افراد شریک ہو کر اس زبان کو فروغ دینے کا کام کریں۔ موجودہ وقت میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی اردو کی فلاح و بہبود اور اس کی چہار سو ترقی کے لیے پابند عہد ہے اور کمیٹی کے تحت مشاعرہ، سمینار اور دیگر ذیلی امور کو مکمل طور پر عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار صدر مشاعرہ طارق جیلانی نے گاندھی بھون، دیوا روڈ، بارہ بنکی میں روشنی کی طرف سوسائٹی کے زیرِ اہتمام و فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی اشتراک سے قومی یکجہتی پر منعقد مشاعرے میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ مشاعرہ قومی یکجہتی کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ اردو مشاعرے ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کا حسین سنگم ہیں۔ مہمانِ خصوصی عالمی شہرت یافتہ شاعر شعیب انور نے کہا کہ مشاعرہ ایک ادبی اور شعری تربیت گاہ ہے، اس سے صرف شاعری کی فہم ہی پیدا نہیں ہوتی بلکہ ایک سلیقہ مندی بھی آتی ہے جو زندگی کا شعور پیدا کرتی ہے اور یہی شعور قومی یکجہتی کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ مہمانِ ذی وقار فیض خمار بارہ بنکوی نے کہا کہ قومی یکجہتی اور حب الوطنی پر منعقد مشاعرے میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ ہمارے محبِّ وطن شعرا نے اپنی شاعری سے محبِّ وطن لوگوں میں ایک نئی جان ڈال دی تھی خصوصاً مجاہدینِ آزادی میں نئی روح پھونک دی جو ملک کو آزاد کرانے میں معاون و مددگار ثابت ہوئی۔ پروگرام کی کنوینر اور سوسائٹی کی صدر رنجنا شرما اور کوآرڈینیٹر ضیاء اللہ صدیقی نے مہمانوں اور شعرا کا استقبال کیا اور شال و مومنٹو پیش کر کے ان کی عزت افزائی کی، دونوں نے فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کا شکریہ ادا کیا اور اس کے ذریعے کی جا رہی اردو خدمات کو بھی سراہا، ان دونوں نے مزید کہا کہ بارہ بنکی کے مزاج میں شعر و شاعری رچی بسی ہے اور جیسے سامعین خاص طور سے مشاعرے کے سامعین بارہ بنکی میں ہیں، دوسرے کسی مقام پر ایسے سامعین ملنا تقریباً ناممکن ہے۔ مقامی اور علاقائی شعرا نے بھی اپنی سنجیدہ شاعری سے ماحول کو خوشگوار بنا دیا۔ مشاعرے میں رات بھر اپنی رونقیں بکھرتی رہیں اور سامعین بڑے سکون اور داد و تحسین کے ساتھ اس مشاعرے سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

'اُردو غزل کا ارتقائی سفر: ابتدا تا حال' کے موضوع پر توسیعی خطبہ

دھنباد(28مارچ)۔بنود بہاری مہتو کوئلانچل یونیورسٹی(BBMKU) دھنباد کے شعبۂ اُردو کے زیرِ اہتمام ایک پُر وقار تعلیمی و ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں رانچی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبہ اور ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز پروفیسر منظر حسین نے 'اردو غزل کا ارتقائی سفر: ابتدا تا حال' کے موضوع پر ایک فکر انگیز توسیعی خطبہ پیش کیا۔ پروگرام کا آغاز تلاوتِ کلام پاک اور نعتِ رسولؐ سے ہوا۔ شعبۂ اُردو کے صدر ڈاکٹر عالمگیر ساحل نے معزز مہمان کا پُر تپاک استقبال کیا اور ان کی علمی و ادبی بصیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ پروفیسر منظر حسین صاحب کی شخصیت اور ان کا تجربہ اردو ادب کے طالبِ علموں کے لیے ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے خصوصی خطاب میں پروفیسر منظر حسین نے اردو غزل کے تاریخی پس منظر، اس کے اسلوب اور موضوعات میں آنے والی تبدیلیوں پر سیر حاصل گفتگو کی۔ انھوں نے ولی دکنی سے لے کر عصرِ حاضر تک کے شعرا کے کلام کا حوالہ دیتے ہوئے واضح کیا کہ غزل نے ہر دور کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی حالات کو اپنے اندر نہایت خوب صورتی سے سمویا ہے اور یہی اس کی بقا اور مقبولیت کا اصل راز ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ غزل صرف جذبات کا اظہار نہیں بلکہ انسانی شعور کی بیداری کا ایک اہم ذریعہ بھی رہی ہے۔ بنود بہاری مہتو کوئلانچل یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر رام کمار سنگھ نے اپنے صدارتی خطاب میں شعبۂ اردو کی اس کاوش کو بے حد سراہا اور پروفیسر منظر حسین کی علمی قدآور شخصیت کا اعتراف کیا۔ انھوں نے کہا کہ ایسی علمی نشستیں یونیورسٹی کے تعلیمی ماحول کو جلا بخشتی ہیں اور طلبہ میں کلاسکی ادب کو سمجھنے کا ذوق پیدا کرتی ہیں۔ انھوں نے شعبۂ اردو کو یقین دلایا کہ یونیورسٹی اس طرح کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی ہمیشہ سرپرستی کرتی رہے گی۔ تقریب کی نظامت شہباز رہبر نے کی اور اظہارِ تشکر کے فرائض پی۔کے۔رائے میموریل کالج کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر عبدالمتین نے انجام دیے۔ اس علمی نشست میں یونیورسٹی کی ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز ڈاکٹر ایتا ورما (آئی ایس ایم، دھنباد) کے سائنٹسٹ ڈاکٹر آفاق احمد، سابق صدر شعبۂ اُردو ڈاکٹر موصوف احمد، آر ایس موڑ کالج کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر جہانگیر احمد، محمد مجاہد خاں، امان اللہ انصاری، محمد وسیم اکرم، ڈاکٹر ابونصر مختلف شعبوں کے اساتذہ ڈاکٹر راجیش کمار، ڈاکٹر مانس آچاریہ، ڈاکٹر جے گوپال منڈل، ڈاکٹر مکندر ویداس، ڈاکٹر تاپتی چکرورتی کے علاوہ ڈاکٹر اقبال حسین، یونس فردوسی جیسے دانشوروں اور طلبہ کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ (اردو روزنامہ 'خبر ایکسپریس'۔دھنباد)

اروندھتی رائے کو بہترین خودنوشت کا ایوارڈ

ممبئی(29مارچ)۔امریکی ادارہ نیشنل بک کریٹکس سرکل (NBCC) ہر سال انگریزی میں شائع ہونے والی بہترین کتابوں کے لیے چھے زمروں میں ایوارڈز کا اعلان کرتا ہے۔ فکشن، نان فکشن، سوانح عمری، خودنوشت، شاعری اور تنقید؛ ان چھے زمروں میں بہترین کتابوں کو این بی سی کی جانب سے ایوارڈز پیش کیے جاتے ہیں۔ اس سال اروندھتی رائے کی یادداشتوں پر مبنی کتاب 'مدر میری کمس ٹو می' (Mother Mary Comes to Me) نے بہترین خودنوشت کا ایوارڈ حاصل کیا ہے۔ اس ایوارڈ کے تحت انھیں دو لاکھ روپے نقد اور ایک مومینٹو پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ ممبر شپ کے ووٹوں کی بنیاد پر دو مزید انعامات دیے جاتے ہیں: کسی بھی صنف میں بہترین پہلی کتاب کے لیے 'جان لیونارڈ پرائز' اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر امریکہ میں شائع ہونے والی کسی بھی صنف کی بہترین کتاب کے لیے 'گریگ بیریوس بک ان ٹرانسلیشن پرائز' دیا جاتا ہے۔ ای بی سی سی 'نونا بالاکین سائٹیشن فار ایکسی لینس ان ریویونگ' بھی پیش کرتا ہے، جو کسی رکن کی شاندار تبصرہ نگاری کو تسلیم کرتا ہے۔ 'ایوان سینڈروف لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ' اور 'نوٹی موریسن اچیومنٹ ایوارڈ' بالترتیب ان شخصیات اور ادبی اداروں کو دیے جاتے ہیں جنھوں نے کتابی ثقافت میں انقلابی خدمات انجام دی ہوں۔ اروندھتی رائے عالمی ادب میں اپنی ایک منفرد شناخت رکھتی ہیں۔ ان کا پہلا ناول 'دی گاڈ آف اسمال تھنگس' 1997 میں شائع ہوا تھا جسے بکر پرائز دیا گیا تھا جب کہ دوسرا ناول 'دی منسٹری آف اَٹ موسٹ ہیپی نیس' بھی عالمی سطح پر پسند کیا گیا۔ (انقلاب۔ممبئی)

دی مسلم انسٹی ٹیوٹ میں دوروزہ قومی سمینار کا انعقاد

نئی دہلی/کولکاتا(26مارچ)۔دی مسلم انسٹی ٹیوٹ کولکاتا کے زیر اہتمام دو روزہ قومی سمینار بہ عنوان 'اکیسویں صدی میں اردو خود نوشت' کے دوسرے دن کا اجلاس نہایت علمی وفکری جوش وخروش کے ساتھ منعقد ہوا۔ واضح رہے کہ اس سمینار کا شاندار آغاز 25 مارچ 2026 کو حاجی محمد محسن ہال، دی مسلم انسٹی ٹیوٹ کولکاتا میں ہوا تھا۔ یہ سمینار مغربی بنگال اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے منعقد کیا گیا۔ دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی نظامت جناب منظر جمیل نے کی۔ اجلاس کا آغاز نہایت سنجیدہ علمی فضا میں ہوا۔ پہلا مقالہ عالیہ یونیورسٹی کولکاتا کے شعبۂ اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر سعید احمد نے 'انتظار حسین کی خودنوشت، جستجو کیا ہے: ایک مطالعہ' کے عنوان سے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ خودنوشت انتظار حسین کی داخلی وخارجی زندگی کی عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی تہذیب وثقافت کی آئینہ دار اور تقسیم ہند کا بھرپور منظر پیش کرتی ہے، تاہم انھوں نے اسے ماضی کی نوحہ خواں قرار دیتے ہوئے اس پہلو کو اس کی ایک بڑی کمزوری بھی بتایا۔ دوسرا مقالہ آفاق حیدر نے 'زماں قاسمی اور کارواں گزر گیا' کے عنوان سے پیش کیا۔ انھوں نے اس خودنوشت کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ 118 صفحات اور 17 ابواب پر مشتمل یہ تصنیف اپنی خوبیوں کے باوجود مصنف کی آپ بیتی کو جگ بیتی بنانے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو پاتی، تاہم مجموعی طور پر اس میں خودنوشت نگاری کے بنیادی اوصاف موجود ہیں۔ تیسرا مقالہ فیضان احمد (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی) نے غضنفر کی خودنوشت 'دیکھی لی دنیا ہم نے' کے تجزیاتی مطالعے پر پیش کیا۔ اس کے بعد سہ ماہی 'فکر وتحریر' کے جنوری تا مارچ 2026 کے شمارے کی رونمائی پروفیسر محمد کاظم (دہلی یونیورسٹی) کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ چوتھا مقالہ شکیلہ بانو (ریسرچ اسکالر کلکتہ یونیورسٹی) نے 'سلطان شاہد کی خودنوشت میں اور میری صحافتی زندگی: ایک تجزیاتی مطالعہ' کے عنوان سے پیش کیا، جب کہ پانچواں مقالہ عبدالوارث (ریسرچ اسکالر جے این یو، نئی دہلی) نے 'اکیسویں صدی کی اردو خودنوشت حکایتِ ہستی: ایک اجمالی جائزہ' کے عنوان سے پیش کیا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر عباس رضا نیر (صدر شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی) نے فرمائی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے تمام مقالہ نگاروں کے مقالات کا تجزیاتی جائزہ لیا اور خاص طور پر اس امر کو سراہا کہ اس سمینار میں طلبہ وطالبات کی فعال نمائندگی رہی جو اسے مزید کامیاب بناتی ہے۔ ہدیۂ تشکر جناب ساجد پرویز (اعزازی ڈیبیٹ سکریٹری، دی مسلم انسٹی ٹیوٹ) نے پیش کیا۔

دوسرے اجلاس میں پہلا مقالہ ڈاکٹر محمد امتیاز احمد (صدر شعبۂ اردو، کلکتہ گرلس کالج) نے احمد سعید ملیح آبادی کی خودنوشت 'میری صحافتی زندگی' پر پیش کیا اور اسے اپنے عہد کی بھرپور عکاسی کرنے والی اہم تصنیف قرار دیا۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر شاہد اقبال (مانو ریجنل سنٹر، کولکاتا) نے قتیل شفائی کی خودنوشت 'گھونگرو ٹوٹ گئے' پر پیش کیا جس میں انھوں نے کہا کہ یہ تصنیف ایک شاعر کی ذاتی زندگی اور اس کے فن کے درمیان ایک مضبوط پُل کا کردار ادا کرتی ہے۔ تیسرا مقالہ ارشاد آرزو (اسسٹنٹ ماسٹر، کلکتہ مدرسہ اے پی ڈپارٹمنٹ) نے رئیس الدین فریدی کی خود نوشت 'دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھا' کے تجزیاتی مطالعے پر پیش کیا، جسے انھوں نے فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق کی ایک زندہ دستاویز قرار دیا۔ چوتھا مقالہ ڈاکٹر احمد معراج نے ف۔س۔اعجاز کی خودنوشت 'یہ میں ہوں' پر پیش کیا اور اسے سوانحی مضامین کا مجموعہ قرار دیا جو اُن کی مکمل حیات کا احاطہ نہیں کرتا۔ آخری مقالہ پروفیسر عباس رضا نیر نے شارب ردولوی کی خودنوشت 'نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم' اور ملک زادہ منظور احمد کی خودنوشت 'رقصِ شرر' کے تقابلی مطالعے پر پیش کیا اور دونوں تصانیف کے اسلوبیاتی اور فکری امتیازات کو اجاگر کیا۔ اختتامی مرحلے میں صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر نعیم انیس نے تمام مقالہ نگاروں کی کاوشوں کو سراہا۔ تاثراتی کلمات جناب اشرف جعفری، ڈاکٹر سعید احمد، جناب اشرف یعقوبی، جناب اعجاز احمد، پروفیسر زین رامش، محترمہ فرزانہ پروین اور پروفیسر عباس رضا نیر نے پیش کیے۔

آخر میں ہدیۂ تشکر جناب شمس الصالحین اعزازی ایجوکیشن سکریٹری دی مسلم انسٹی ٹیوٹ نے پیش کیا، جس کے بعد ظہرانے کے ساتھ یہ دوروزہ قومی سمینار سہ پہر ساڑھے تین بجے بہ حسن وخوبی اختتام پذیر ہوا۔ (سیاسی تقدیر۔دہلی)

کرناٹک اردو ساہتیہ پریشد کی جانب سے
اقلیتی طلبہ کے لیے تحریکی ورکشاپ

گدی بنڈہ(16مارچ)۔ایس ایل سی امتحان ہر طالبِ علم کے لیے اہم ترین مرحلہ ہوتا ہے، طلبہ کو اعتماد کے ساتھ امتحان میں شرکت کرنی چاہیے اور اچھے نمبر حاصل کرنے چاہئیں۔ تعلقہ کے سرکاری اردو اسکول میں کرناٹک اردو ساہتیہ پریشد نے طلبہ میں اعتماد پیدا کرنے کے لیے ایک پروگرام کا انعقاد کیا۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ امتحان آتے ہی طلبہ کو خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ محنت سے پڑھنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ اگر آپ غور سے پڑھیں گے تو آپ کو اچھے نتائج ملیں گے۔ پڑھتے وقت کسی اور چیز پر توجہ نہ دیں بلکہ تعلیم پر توجہ دیں۔ انھوں نے طلبہ کو توجہ دلائی کہ وہ آئندہ ایس ایس ایل سی امتحان میں اچھے نتائج حاصل کریں اور پوری ریاست میں پہلا مقام حاصل کریں۔ والدین کو ان سے بہت زیادہ توقعات وابستہ ہوتی ہیں، اس لیے اس خوف کو چھوڑ دیں کہ جب امتحان آجائے تو کیا کرنا ہے اور استاد کی رہنمائی میں مطالعہ کریں۔ محنت سے کچھ بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ موبائل کا زیادہ استعمال نہ کریں۔ موبائل کا اتنا ہی استعمال کریں جتنا یہ آپ کی پڑھائی کے لیے مفید ہے۔ بلاضرورت وقت ضائع نہ کریں۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ وہ اچھے نتائج حاصل کر کے اپنے والدین کا نام روشن کریں۔ جس اسکول میں وہ پڑھتے ہیں اس شہر کا اور اسکول کا نام روشن کریں اور والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں پر نظر رکھیں۔ اس موقعے پر اساتذہ، اردو ساہتیہ پریشد کے اراکین، ایس ڈی ایم سی کے اراکین وغیرہ موجود تھے۔

(سالار۔بنگلور)

سیر المنازل
(مرزا سنگین بیگ)
شریف حسین قاسمی
قیمت:600روپے

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : باغِ گلِ سرخ
شاعر : افتخار عارف
ضخامت : صفحات
قیمت : 300روپے
ناشر : انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، راؤز ایونیو نئی دہلی-110002
تبصرہ نگار : ڈاکٹر رضیہ حامد

افتخار عارف کا شمار بین الاقوامی شعرا میں کیا جاتا ہے، ان کے دو مجموعے 'مہر دونیم' اور 'باغِ گلِ سرخ' شائع ہو چکے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب کی ابتدا میں انیس اشفاق اور ایران کے رئیس فرہنگستان زبان وادب اور فارسی ڈاکٹر غلام علی حداد عادل کے رشحاتِ قلم افتخار عارف اور ان کی شاعری کے متعلق شاملِ اشاعت ہیں۔ افتخار عارف کی پرورش و پرداخت تہذیب کے لیے نامور شہر لکھنؤ میں ہوئی۔ بلاشبہ وہ لکھنؤ کے نمائندہ زبان وادب وتہذیب کے شاعر ہیں۔

میں آج بھی ہوں اسی لہجہ و لغت کا اسیر
نمود کرتی ہے تہذیبِ لکھنؤ مجھ میں

افتخار عارف ہندو پاک میں بہت معروف ہیں، ہندستان کے دارالسلطنت دہلی کے معروف ومقبول مشاعروں میں ان کی شرکت مشاعرے کے وقار کو بڑھا دیتی ہے۔

افتخار عارف غزل، نظم اور مرثیہ نگاری پر کامل قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں کربلا کے استعاروں کا بھی بھرپور استعمال موجود ہے۔ انھوں نے کربلا کے استعارے کو دوسرے شعرا کے مقابلے میں زیادہ استعمال کیا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں کربلا اور اس کے متعلقات کا استعمال کثرت سے کیا ہے اور ان کو مختلف معانی اور مفاہیم پہنائے ہیں۔

افتخار عارف کے ہاں اپنے مادرِ وطن سے دلی لگاؤ کی وجہ سے اس کی تہذیب کے مٹنے کا ماتم ہے۔ جب معاشرے میں انتشار ہو تو رزق کی تلاش بھی ایک مسئلہ بن جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے شہر در شہر تلاش کے لیے جانا جس کی وجہ سے گھر کو خیر باد کہنے پر مجبور ہونا بھی ایک المیہ ہے۔ خانہ بدوشوں کی زندگی گزارنے پر مجبور اپنے اپنے گھروں کو یاد کرتے ہیں۔ افتخار عارف بھی ایسے ہی حالات سے دوچار تھے۔ کہتے ہیں:

تمام خانہ بدوشوں میں مشترک ہے یہ بات
سب اپنے اپنے گھروں کو پلٹ کے دیکھتے ہیں

☆

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا

افتخار عارف کی شاعری میں لکھنؤ کا تہذیب وتمدن اور فنونِ لطیفہ کا جا بجا اظہار ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ہجرت کا غم اور دوسری تہذیب سے ربط و ضبط کے ساتھ زندگی گزارنے کی جدوجہد کا اظہار بھی ہے:

بس ایک شام اسے آواز دی تھی ہجر کی شام
پھر اس کے بعد اسے عمر بھر پکارا نہیں

چند مزید اشعار ملاحظہ کریں:

بہت آزادی بھی اچھی نہیں عشق کے بیچ
اے گرفتار طلسمِ خمِ گیسو مجھے دیکھو

کیا مجھ کو ڈرا سکتی ہے مہریٔ ایام
خورشیدِ امامت کا ہے سایہ مرے در پر

☆

کچھ دن سے عجب اِک کمال آیا ہے مجھ میں
پڑھتا ہوں جو دیوار پہ لکھا نہیں ہوتا

☆

سارے ادب آداب ہنر یوں ہی تو نہیں آجاتے
عمریں تج دینا پڑتی ہیں اِک حرف رقم کرنے کے لیے

گھر کی وحشت سے لرزتا ہوں مگر جانے کیوں
شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے

یہ مجموعہ بہت دیدہ زیب ٹائٹل سرخ پھولوں سے مزین ہے، جسے انجمن ترقی اردو (ہند) نے بہت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس کی قیمت بھی آج کی گرانی کو دیکھتے ہوئے مناسب ہے۔ اس کو ہر لائبریری اور صاحبِ ذوق حضرات کو اپنے کتب خانے میں رکھنے کے لیے متوجہ ہونا چاہیے۔

◆◆◆

سیّد ابراہیم ماموں: ایک نفسِ فراموشیدہ

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

اور فی البدیہہ ایک نیا مضمون تیار ہو جاتا۔ ابراہیم ماموں کی شخصیت میں بذلہ سنجی اور حاضر جوابی بہ درجہ اتم پائی جاتی تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کے بیشتر انشائیہ نما مضامین طنز وظرافت کی کیفیتوں سے معمور ہیں۔ انہی اوصاف کے پیشِ نظر مقامی اخبار روزنامہ 'سلامتی' نے ایک مستقل کالم 'سوال آپ کے، جواب ماموں کے' کا آغاز کیا تھا۔ اس کالم میں ماموں قارئین کے سوالات کے ایسے برجستہ، دلچسپ اور معلومات افزا جوابات دیتے کہ پڑھنے والے ان کی شگفتہ بیانی سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ پاتے۔ اپنے اسی منفرد اندازِ تحریر کی بدولت یہ کالم قارئین میں بے حد مقبول رہا۔

ابراہیم ماموں نے انشائیوں اور فکاہیہ مضامین کے علاوہ مختلف ادبی شخصیتوں کے فکر وفن پر بھی نہایت عمدہ مضامین قلمبند کیے۔ صحافت سے ان کی وابستگی حد درجہ گہری تھی۔ اخبارات کے لیے مراسلے اور رپورٹیں لکھنا ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ ان تمام علمی وادبی مصروفیات کے درمیان ان کا ایک نہایت اہم اور نمایاں کام مختلف اداروں کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے ادبی وتہذیبی مقابلوں کے لیے طلبہ وطالبات کی تربیت کرنا بھی تھا۔ وہ نہ صرف تحریری وتقریری مقابلوں میں شریک ہونے والے طلبہ کی تحریروں کی اصلاح کرتے، بلکہ ضرورت پڑنے پر انھیں مضامین اور تقریریں لکھ کر بھی دیتے۔ تقریری مقابلوں کے لیے وہ باقاعدہ مشق کرواتے اور طلبہ کو فنِ خطابت کے رموز ونکات سے روشناس کراتے۔ وہ ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتے اور شاگردوں کی کامیابیوں پر مسرت کا اظہار کرتے۔

ابراہیم ماموں کے تحریر کردہ مضامین اس وقت کے اخبارات و رسائل کی زینت تو بنے، تاہم ان کی طبعی بے نیازی نے انھیں کتابی صورت میں مجتمع کرنے کی جانب مائل نہیں کیا۔ نتیجتاً یہ قیمتی اثاثہ امتدادِ زمانہ کی نذر ہو گیا۔

سیّد ابراہیم ماموں کو اس دنیا سے رخصت ہوئے کم وبیش تین دہائیاں بیت چکی ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وقت کی بے رحم گردنے ان کے نام ونشان کو اس طرح مٹایا کہ اب کوئی ان کا ذکر کرنے والا بھی باقی نہیں۔ پرانی نسل رخصت ہو گئی اور نئی نسل ان کے نام وکام سے یکسر ناواقف ہے۔ یہاں تک کہ ادبی تاریخ کے اوراق بھی اس درویش صفت انسان کے تذکرے سے خالی ہیں۔ وہ ایک ایسی شمع تھے جو خاموشی سے جلی اور دوسروں کی راہ روشن کر کے خود گمنامی کے اندھیروں میں کھو گئی، مگر ان جیسے بے لوث خدمت گزاروں کی خاموش خدمات ہی دراصل ہماری علمی وادبی تہذیب کی اصل اساس رہی ہیں۔

Plot No. 19, Gulmohar Hills,
Ring Road, Gulburagi-585105
Mob. No.: 9342353312
E-mail: draneessiddiqui@yahoo.com

مادری زبان کی چاشنی ذہن نشینی سے دل نشینی تک

(بقیہ صفحہ 3 سے آگے)

یہی خواب وخواہش گاندھی جی کی بھی تھی۔ 21 جنوری 2026 کو دنیا بھر میں بین الاقوامی مادری زبان کا دن منایا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں 17 کروڑ سے زیادہ افراد اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔ اس فورم پر میری تیسری تجویز یہ ہے کہ 'ہندستانی' یعنی اردو اور ہندی کو ملا کر پیش کریں تو 'ہندستانی' اقوامِ متحدہ کی ساتویں سرکاری زبان بن سکتی ہے۔ چوں کہ فیصد کے حساب سے یہ دنیا کی تیسری بڑی زبان بن جائیگی۔ سرزمینِ دکّن کے مقبول ترین شاعر مخدوم محی الدین نے اپنی نظم 'غالب' میں مایوسی کا اظہار کیا تھا:

وہ زبان جس کا نام ہے اُردو
اٹھ نہ جائے کہیں خوشی کی طرح

بقولِ مشتاق دربھنگوی!

ہیں شہد سے زیادہ الفاظ اس کے میٹھے
دنیا کی ہر زباں سے، شیریں زباں ہے، اُردو

مگر، اس 'عالمی یومِ مادری زبان' کے موقعے پر ہمیں داغ دہلوی کی بھی یاد آرہی ہے:

اردو ہے جس کا نام، ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دُھوم ہماری زبان کی ہے

جاوید وِلا، گراؤنڈ فلور، مکان نمبر 12-2-419/A/3/1
الاپتی نگر، مہدی پٹنم، حیدرآباد-500028 (تلنگانہ)
Mob. No. +91 6309727951
E-mail: abuumarsiddiqi@gmail.com

اُردو زبان وادب کا پہلا محقق ومدرس

جان بارتھ وِک گل کرسٹ

تالیف وترجمہ: صدیق الرحمٰن قدوائی

قیمت: 250روپے

اردو کا ایک نابغہ تخلیقی فنکار: ابنِ صفی

(بقیہ صفحہ 2 سے آگے)

انسانی ذہن کی کج روی اور فکر ونظر کی محدودیت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ 'نیلم کی واپسی' کا یہ اقتباس دیکھیے کہ جس میں ہمارے سماج میں عورتوں کے تئیں کس کس طرح کے نظریے پروان چڑھتے ہیں، اُن کی آئینہ داری کی گئی ہے۔ اس اقتباس میں طنز بھی ہے اور ایک خاص نظریے کی وضاحت بھی:

''سنو سوئٹی، تم دنیا کی دوسری عورتوں سے مختلف نہیں ہو اور عورت سگریٹ کے پیکٹ کی طرح ہمیشہ جیب میں نہیں پڑی رہتی۔ اس کی اہمیت صرف بیس سگریٹوں تک محدود ہے اس کے بعد وہ جیب سے ردی کی ٹوکری میں منتقل ہو جاتی ہے

اس بکواس کا مطلب؟

یہی کہ اگر تم سچ مچ میری بیوی ہوتیں تو کبھی کی ردی کی ٹوکری میں منتقل ہو چکی ہوتیں، میرے لیے عورت کی پہلی مسکراہٹ دلکش، دوسری قابلِ برداشت، تیسری بورنگ اور چوتھی بالکل ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کسی بندریا نے دانت دکھائے ہوں!''

ابنِ صفی ایک جینیس فنکار تھے اور ان کے ذہن میں ماضی کے تلخ وشیریں تجربے تھے، حال کا مشاہدہ تھا اور مستقبل کی فکر۔ وہ اپنے زمانے سے آگے کی فکر رکھتے تھے اور آنے والے وقتوں میں کیا کچھ ہوگا اس کی بصیرت سے لبریز تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی کہانی 'جنگل کی شہریت' جو 'جاسوسی دنیا' مئی تا جولائی 1977 میں شائع ہوئی تھی، اس میں وہ افریقی ملک تنزانیہ کی سیر کراتے ہیں۔ زیرولینڈ کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ تنزانیہ کے جنگلوں میں زیرولینڈ کے کارخانوں میں کام کرنے والے مفلوک الحال لوگوں کی داستان بیان کرتے ہیں اور پھر عمران پر زیرولینڈ کے ایجنٹ ہونے کا شک ظاہر کرتے ہیں اور اس کے کیمرے سے وہاں کی ہلاکت خیزیاں دکھانے کا کام کرتے ہیں۔ میزائلوں کے پروجکٹ اور ہلاکت خیزی کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ آج جب اسرائیل اپنے بلاسٹک میزائل اور لیزر بم کے ذریعے ہلاکت خیزیاں برپا کر رہا ہے، ایران پر لیزر بم سسٹم کا استعمال کر رہا ہے جس لیزر بم میں ایک انتہائی شدت کی شعاعیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اسی کہانی میں ابنِ صفی نے ایسے پرندوں اور جانوروں کا ذکر کیا ہے کہ جس کے جسم کو آپریشن کر کے اس کی آنکھ اور پیٹ میں کیمرے اور ٹرانزسٹر کے ساتھ ساتھ آتش گیر مادہ نصب کیا جاتا ہے۔ پرندے جن میں طوطے اور جانور میں بندر شامل ہیں پورے جنگل میں نگرانی کا کام کرتے ہیں۔ اس کہانی میں ایک طرف سائنسی انقلابات کی خبر دی جا رہی ہے تو دوسری طرف بین الاقوامی ریشہ دوانیوں کا خلاصہ بھی کیا جا رہا ہے کہ کس طرح طاقتور ممالک ترقی پذیر ممالک پر نظر رکھتے ہیں اور بالخصوص مسلم ممالک کو اپنا لقمۂ اجل بناتے ہیں۔ نصف صدی پہلے ابنِ صفی کی یہ کہانی، آج فلسطین کے غازہ پٹی، لبنان کے بیروت اور ایران کی سرزمین کو کس طرح اسرائیل سائنسی تکنیک کے سہارے دھواں دھواں بنا رہا ہے اور لاکھوں افراد کی ہلاکتیں ہو رہی ہیں لیکن عالمی برادری بس تماشائی بنی ہوئی ہے۔ ابنِ صفی کی کہانی 'جنگل کی شہریت' ان کی دانشوری اور دوراندیشی کا پتا دیتی ہے۔ اسی طرح کا ایک ناول 'لاشوں کا آبشار' (1945) ہے جس میں ابنِ صفی نے انسانی ذہن کی فتنہ سازیوں اور انتقامی جذبے کی عکاسی کی ہے۔ اس ناول میں وائرلیس ویپین (Wireless Weapons) کا تذکرہ کیا ہے کہ کس طرح ہزاروں کے مجمعے میں وائرلیس ویپین سے نشانہ بنایا جاتا ہے۔ حال ہی میں ایران میں حزب اللہ کے ایک لیڈر کو اسرائیلی فوج کے ذریعے اسی تکنیک کے سہارے لقمۂ اجل بنایا گیا۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابنِ صفی اپنے قارئین کی ذہنی اور فکری تربیت کے تئیں کس قدر سنجیدہ تھے اور جدید سائنسی ایجادات کے خطرات سے عالمی برادری کو آگاہ کرنے کا علمی وادبی کارنامہ انجام دے رہے تھے۔

ابنِ صفی کو پڑھتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ ساٹھ کی دہائی میں نظریۂ لسان اور بالخصوص تخلیقی قواعد کی بحث سے بھی خوب واقف تھے۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں بھی ادب کا ایک طالبِ علم ہوں اور لسانیات میں قدرے گہری دل چسپی رہی ہے۔ واضح ہو کہ 1950 کی دہائی میں شعبۂ لسانیات میں ایک انقلاب سا آیا کہ مختلف ماہرین نے انسانی ذہن میں زبان کی کارفرمائی پر الگ الگ نظریے پیش کیے۔ بالخصوص ماہرِ نفسیات بی۔ ایف سکنر (B.F. Skineer) کی کتاب 'ورول بیہویر' (Verval Behavior) شائع ہوئی اور اس پر خوب خوب چرچا ہوا۔ اسی دور میں نوم چامسکی کا عروج ہوا اور اس کے نظریۂ لسانیات کی قبولیت عام ہوئی اور برسوں تک امریکہ کے ساتھ ساتھ دیگر یوروپی ممالک میں انسان کے قوتِ لسان اور صلاحیتِ زبان سیکھنے پر بحث ہوتی رہی۔ مجھے لگتا ہے کہ ابنِ صفی نے ان بحثوں سے استفادہ کیا اور زبان کے استعمال کی ظاہری سطح (Surface Structure) اور عمیق سطح (Deep structure) کا استعمال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ان کرداروں کے مکالمے میں لسانیاتی نفسیات وفلسفے کی باریکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کے یہاں مکالمے میں اظہار کی ایک بامعنی تشریح دکھائی دیتی ہے۔ زبان کی توضیح اور تجزیاتی مطالعے کا علم رکھنے والے اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ جب کسی انسان کے اندر زبان کی منظّم توضیحات اور معنوی انسلاکات کی قوت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اس کی زبان نہ صرف بامعنی ہوتی ہے بلکہ اس کے جملے کی ساخت میں روانی کے ساتھ ساتھ ایک چاشنی بھی پیدا ہو جاتی ہے جو قارئین کو اپنے سحر میں مسحور رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابنِ صفی کی تحریروں نے ان کے ہم عصروں کو بھی متاثر کیا اور اس عہد کے بڑے سے بڑے لکھاریوں کو مجبور کیا کہ وہ ابنِ صفی کی روش اختیار کریں لیکن وہ اس میں ناکام رہے۔ ظاہر ہے کہ بقولِ فرڈی نینڈ ڈی ساسیور (Ferdinanad De Saussure) کہ انسان کی لسانی صلاحیتیں اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتی ہیں اور خیالات کی درجہ بندی میں معاون ہوتی ہیں۔ نوم چامسکی (Noam chomsky) نے بھی اپنے ایک مقالہ 'لینگو تیج اینڈ فریڈم' میں اس کی وضاحت کی ہے:

"Language is the product of human intelligence that is, for the moment , most eccessible to study, A rich tradition held language to be a mirror of mind. To some extent, there is truth and useful insight in this idea" (On Anarchism-Penguin Books-Ed 2013, P:142)

میرے خیال میں ابنِ صفی نے عصری لسانی نظریے کے مطالعے کی بدولت اپنی تحریروں میں لسانی تنوع پیدا کیا جس کی وجہ سے وہ ایک منفرد اسلوب کے فنکار ثابت ہوئے، لیکن افسوس صد افسوس کہ ہمارے پیشہ ور نقادوں کی نگاہ کبھی ابنِ صفی کے لسانی طریقِ اظہار کی طرف گئی ہی نہیں اور جاتی بھی کیوں کر کہ سبھی نے پہلے ہی ابنِ صفی کو ایک تفریحی رائٹرس کے خانے میں ڈال رکھا تھا۔ کاش! ہمارے ناقدینِ ادب ابنِ صفی کی انقلابی فکر، سائنسی نظریے اور لسانی تجربے کو اپنا موضوع بناتے تو آج اردو زبان وادب کی تاریخ میں نہ صرف ابنِ صفی کے لیے صفحات در صفحات مخصوص ہوتے بلکہ عالمی ادب میں بھی ان کی موجودگی نظر آتی۔ اس تلخ حقیقت کا اعتراف ڈاکٹر سلیم اختر بھی اپنی کتاب 'اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ' میں مختصراً ہی سہی لیکن کرنے پر مجبور ہوئے ہیں:

''اگرچہ ابنِ صفی کو ثقہ ناقدین نے کبھی ادیب نہ گردانا مگر تقریباً اڑھائی سو ناولوں کے مصنف سے صرفِ نظر بھی ممکن نہیں۔ جاسوسی اور فینٹسی کے امتزاج سے وہ مسلسل سسپنس پیدا کرنے میں کامیاب رہتا ہے اور اسی لیے ہر عمر اور مذاق کے قارئین میں بے حد مقبول تھا۔ اگر وہ یوروپ میں ہوتا تو اسے وہاں آئین فلیمنگ کے پایے کا ناول نگار سمجھا جاتا اور اس کا کرنل فریدی جیمز بونڈ 007 سے کم مقبول نہ ہوتا اور کچھ ایسا ہی عالم کیپٹن حمید اور عمران جیسے کرداروں کا ہوتا۔''

(ص:502)

مجھے خوشی ہے کہ تاخیر سے ہی سہی اردو دنیا کی آنکھ کھلی ہے اور ابنِ صفی کو مطالعے کا موضوع بنایا جا رہا ہے۔ ان پر سمینار اور مذاکرے بھی ہونے لگے ہیں اور رسائل وجرائد میں گوشے شائع ہونے کے ساتھ ساتھ ابنِ صفی کی شخصیت اور ان کے فکر وفن پر خاص نمبر بھی شائع ہو رہے ہیں لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے جب اردو کی نئی نسل کتابوں کی قرأت کے اوصافِ جمیلہ سے محروم ہو گئی ہے۔ پھر بھی اگر ابنِ صفی پر اکیڈمک بحث ہو رہی ہے تو یہ قابلِ تحسین عمل ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ حال کے دنوں میں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی ابنِ صفی کے ناولوں کی اشاعت ہو رہی ہے۔ انگریزی میں شمس الرحمان فاروقی جیسے ناقد نے بہت پہلے جب ابنِ صفی کے چار ناولوں کا ترجمہ کیا تھا تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ میرے خیال میں انھوں نے 'پانی کا کنواں، ڈاکٹر ڈریڈ، پانی کا دھواں' اور 'لاش کا قہقہہ' ترجمہ کیا تھا اور انگریزی داں طبقے میں خوب پڑھا گیا تھا۔ بلال تنویر نے بھی عمران سیریز کے دو ناولوں 'خوفناک عمارت' اور 'خطرناک آدمی' کا ترجمہ کیا تھا جسے رینڈم ہاؤس، دہلی نے شائع کیا تھا۔ اب جب کہ ابنِ صفی پر از سرِ نو اکیڈمک بحث کا آغاز ہوا ہے تو مجھے یقین ہے کہ ابنِ صفی جیسے ایک نابغہ تخلیقی فنکار کے افکار و نظریات کی عصری معنویت کی قبولیت کا راستہ ہموار ہوگا اور اردو کا وہ طبقہ جو ابنِ صفی کے فکری بحرِ ذخّار کی گہرائی وگیرائی تک رسائی نہیں رکھتا ان کے لیے بھی مستفیض ہونے کے امکانات روشن ہوں گے۔

پرنسپل، سی۔ ایم۔ کالج، دربھنگہ (بہار)
E-mail: rm.meezan@gmail.com
Mob. No. 9431414586

اردو ہندی ڈکشنری
انجمن ترقی اردو (ہند)
قیمت: 300 روپے

اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری
مولوی عبدالحق
قیمت: 500 روپے

سیّد ابراہیم ماموں: ایک نفسِ فراموشیدہ

ڈاکٹر انیس صدیقی

اس رہ گزارِ جہاں سے بعض شخصیتیں کچھ اس خاموشی کے ساتھ گزر جاتی ہیں کہ ان کی رحلت کا ملال محض وقتی ثابت ہوتا ہے۔ پھر وقت کی بے رحم موجیں ان کے نقوشِ قدم کو کچھ اس طرح مٹا دیتی ہیں گویا بساطِ ہستی پر کبھی ان کا وجود ہی نہ تھا۔ وہ عالی صفات شخصیتیں، جو اپنے عہد کی فکری وتہذیبی تعمیر میں خاموشی سے خشتِ اوّل کا کام کرتی ہیں، اکثر تاریخ کے روشن ابواب میں جگہ نہیں پاتیں۔ نہ کہیں ان کے جوش وجذبے کا تذکرہ ہوتا ہے، نہ ان کی حیات وخدمات کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور نہ ان کی بے لوث قربانیوں پر کوئی حرفِ تحسین ہی بلند کیا جاتا ہے۔

سیّد ابراہیم ماموں شہرِ علم وادب گلبرگہ کی مٹی سے ابھرنے والی ایک ایسی ہی بلند قامت اور دلنواز شخصیت کا نام ہے، جنھوں نے دمِ واپسیں تک اردو زبان وادب کے ساتھ اپنی والہانہ وابستگی کا حق ادا کیا۔ مگر افسوس کہ مرورِ ایام نے نہ ان کے نام کی تختی کو سلامت رکھا اور نہ ان کے علمی وادبی کاموں کا تذکرہ ہی اب کہیں سنائی دیتا ہے۔

ابراہیم ماموں محض ایک فرد کا نام نہیں، بلکہ وہ علم شناسی، درویشانہ استغنا اور انقلابی تڑپ سے گندھی ہوئی ایک منفرد طرزِ حیات کا استعارہ تھے۔ ان کے سوانحی کوائف سے ان کے عہدِ حیات میں بھی بہت کم لوگ واقف تھے، اور جو شناسائے راز تھے، اب وہ بھی اس دنیا میں نہیں رہے۔

جہاں تک یادِ ماضی کے دریچے وا ہوتے ہیں، اسٹیشن ایریا میں واقع ایک مخدوش وشکستہ مکان ان کا مسکن تھا۔ ان کے تعلیمی مدارج کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا تو مشکل ہے، البتہ یہ حقیقت ہے کہ انھیں ایک سرکاری ملازمت حاصل ہوئی تھی، مگر فطرتاً آزاد منش ہونے کے سبب انھوں نے غلامی کے اس طوق کو گلے سے اتار پھینکا اور استعفیٰ دے کر سبکدوشی اختیار کر لی۔ اشتراکی نظریات کے پروردہ ہونے کے سبب وہ کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوئے اور عمر بھر اسی نظریے پر کاربند رہے۔ انھوں نے زندگی بھر تجرد کی راہ اپنائی۔ اپنی بود وباش کے لیے ایک طویل عرصہ سائیکلوں کے پنکچر جوڑنے کی دکان بھی چلائی، جو ان کی غیرت مندی، خودداری اور محنت کی حرمت میں یقین کی ایک روشن مثال تھی۔ حیاتِ مستعار کے آخری ایام میں ان کے ایک عم زاد نے ان کی کفالت کا فریضہ بخوبی سرانجام دیا۔

گزرتے وقت کی گرد نے لوحِ حافظہ پر ابراہیم ماموں کے نقوش کو کسی قدر دھندلا دیا ہے، مگر ان کی قامت کی شبیہ آج بھی ذہن میں محفوظ ہے۔ اکہرا اور چھریرا بیضوی چہرہ، سپیدی مائل سانولی رنگت، ستواں ناک، قدرے باریک مگر گہری آنکھیں، مونچھوں سے مل کر دائرہ سا بناتی فرنچ کٹ داڑھی، سر کے بال پیچھے کی جانب جمے ہوئے جن سے پیشانی مزید کشادہ نظر آتی تھی۔ وہ جب بھی باہر نکلتے، موسموں کے سرد وگرم سے بچنے کے لیے ہمیشہ سر پر ایک بڑا سا رومال لپیٹے رکھتے۔ بدن پر سفید کاٹن کا شکن آلود بغیر کالر والا کرتا، اسی قماش کا ڈھیلا ڈھالا پاجامہ اور پاؤں میں گرد سے اٹی ہوئی ہوائی چپل۔ بظاہر عسرت کا پیراہن اوڑھے یہ شخص، باطن میں علم وآگہی کے جواہر اور جولانیِ قلم کی دولت سے مالا مال تھا۔ سچ ہے کہ اللہ میاں کا یہ کارخانہ بھی عجیب ہے، یہاں خاردار جھاڑیوں کے سایے میں بھی کبھی کبھی علم وادب کے ایسے نایاب گلاب کھلتے ہیں۔

ابراہیم ماموں کی شخصیت کا ایک ناگزیر جزو کپڑے کی ایک کشادہ تھیلی تھی، جو سایے کی طرح ہمیشہ ان کے ہمراہ رہتی۔ اس تھیلی کو اگر ان کی علمی وادبی کائنات کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، کیوں کہ لکھنے پڑھنے کا جملہ اثاثہ اسی میں ہمہ وقت موجود رہتا۔ قلم، پنسلیں، کاغذات کا انبار، ان کے نام آئے مکاتیب، نئے پرانے اخبارات ورسائل اور بالخصوص پوسٹ کارڈز اور ان لینڈ لیٹرز کا ایک ذخیرہ۔ یہ وہ عہد تھا جب دور بسنے والوں سے پیام وسلام کا واحد سہارا نامہ وپیام ہی ہوا کرتا تھا۔ چناں چہ ماموں اپنے نام موصول ہونے والے ہر خط کا جواب دینا خود پر لازم سمجھتے۔ ان کا شغفِ تحریر اس درجے پر تھا کہ بسا اوقات وہ قرب وجوار میں مقیم احباب سے بھی محض بُعدِ مسافت کے پیشِ نظر، خط وکتابت کے ذریعے ہی رشتۂ کلام استوار رکھتے۔

ابراہیم ماموں شرافتِ نفس، نیک طینتی اور اخلاصِ قلبی کا مجسمہ تھے۔ عجز وانکسار ان کی شخصیت کا طرۂ امتیاز تھا اور وہ ہمیشہ نمود ونمائش سے محترز رہتے، جس کام کا بیڑا اٹھاتے، اسے کمالِ ذمہ داری اور دیانت داری سے پایۂ تکمیل تک پہنچاتے۔ چوں کہ وہ شہر کے علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی حلقوں میں یکساں مقبول اور شہر کی ایک ایک گلی، ایک کوچے سے واقف تھے، اس لیے کوئی بھی تقریب ہو، خواہ ادبی و سیاسی جلسے ہوں یا نجی محافل، منتظمینِ دعوت ناموں کی تقسیم کی ذمہ داری اکثر انھیں ہی تفویض کرتے۔ وہ بھی کبھی عذر پیش نہ کرتے بلکہ خوش دلی سے اسے قبول کر لیتے۔ ان کے احساسِ ذمہ داری کا عالم یہ تھا کہ وہ باقاعدہ ایک فہرست مرتب کرتے اور ہر مدعو سے اس کی وصولیابی کے دستخط لیتے۔ اس فہرست میں ایک کالم 'کیفیت' کا بھی ہوتا جس میں وہ نہایت دلچسپ اور جامع تفصیل درج کرتے۔ مثلاً: ''دروازے پر دستک دی گئی، مگر کوئی برآمد نہ ہوا، لہٰذا دعوت نامہ دروازے کی دراز سے اندر ڈال دیا گیا''۔ یا ''دروازہ مقفل پایا گیا، اس لیے کارڈ پڑوس میں مقیم عائشہ بی کے سپرد کر دیا گیا''۔ یہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات دراصل اپنے کام کے تئیں ان کی لگن اور استقامت کی مظہر ہیں۔

ابراہیم ماموں سے میرے مشفقانہ روابط دیرینہ تھے۔ زمانۂ طالبِ علمی میں ان کی فیض رساں صحبتوں سے کسبِ فیض کے متعدد مواقع میسر آئے۔ میرے علمی وادبی ذوق کی تربیت اور خامہ فرسائی کی صلاحیتوں کو صیقل کرنے میں ان کی رہنمائی ہمیشہ شاملِ حال رہی۔ مجھے آج بھی وہ وقت یاد ہے جب کسی نشست میں میری زبان سے 'بہ درجۂ اتم' کا تلفظ غلط ادا ہوا، تو انھوں نے اسی لمحے کمالِ شفقت سے میری تصحیح فرمائی۔ ایسی بے شمار یادیں میرے صحیفۂ یادداشت میں محفوظ ہیں، تاہم یہاں ان تمام کا استحضار مقصود نہیں۔

ابراہیم ماموں کی یہ تربیتی تڑپ اور مربیانہ روش محض مجھ تک محدود نہ تھی، بلکہ جس کسی نوجوان میں انھیں ذرا سی بھی صلاحیت کی رمق نظر آتی، وہ اسے نکھارنے اور جلا بخشنے کے لیے کمر بستہ ہو جاتے۔ دراصل نئی نسل کی فکری آبیاری کرنا اور نوآموزوں کو شاہراہِ ترقی پر گامزن دیکھ کر مسرور ہونا، ان کی جبلت اور فطرت کا خاصہ تھا۔ ان کی اسی روشن خیالی اور حُرّ دنوازی کی ایک تابندہ مثال وہ واقعہ ہے جب 1985 میں، دورانِ طالبِ علمی، کرناٹک اردو اکادمی بنگلور کے رکن کی حیثیت سے میری نامزدگی عمل میں آئی۔ میں ان دنوں گریجویشن کا طالبِ علم تھا اور ایک ادبی رسالہ 'نوائے عصر' بھی شائع کر رہا تھا۔ ایک نوعمر طالبِ علم کی اتنے معتبر سرکاری ادارے کے لیے نامزدگی پر ادبی وصحافتی حلقوں میں اعتراضات کا ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ یہاں تک کہ ایک مقامی اخبار نے تو کارٹون کے ذریعے میری اس نامزدگی کا مضحکہ اڑانے میں بھی کسر نہ چھوڑی۔ ایسے وقت میں ابراہیم ماموں نے تنِ تنہا میری حمایت کا محاذ سنبھالا۔ انھوں نے نہ صرف مختلف با اثر شخصیات سے رجوع کر کے میری اہلیت اور تائید میں بیانات قلم بند کروائے بلکہ انھیں اخبارات کی زینت بھی بنوایا، تاکہ مخالفین کے بے جا پروپیگنڈے کا مسکت جواب دیا جا سکے۔

ابراہیم ماموں ایک قلم برداشتہ لکھاری تھے۔ ان کا تحریری عمل کسی خاص نظم یا وقت کا پابند نہ تھا، بلکہ جب اور جہاں بھی فرصت کے چند لمحات میسر آتے، وہ اپنے تھیلے سے کاغذ قلم نکالتے ...(بقیہ صفحہ 6 پر)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر: محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
معاون مدیران: منور حسن کمال، سالم فاروق ندوی
Assisistant Editors :
Munawwar Hasan Kamal, Salim Farooq Nadwi
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***